© rasailojaraid.com

حرفِ آغاز

ترجیحاتِ دین

سید جلال الدین عمری

ترجیحاتِ دین کا سوال بہت اہم ہے۔ دین کی بعض اساسات ہیں اور بعض کی حیثیت فروع کی ہے۔ جو اہمیت اصول کی ہے وہ فروع کی نہیں ہے، اس لیے کہ فروع اصول کی تابع ہیں اور ان ہی سے نکلتی ہیں۔ ان اساسات ہی کے ذریعے دین کی ترجیحات متعین ہوتی ہیں۔ یہ ترجیحات بدل جائیں تو اس کا امکان ہے کہ اصولِ دین کی طرف تو توجہ کم ہو یا بالکل نہ ہو اور فروعِ دین کی جو حیثیت ہے اس سے زیادہ ان کو اہمیت دی جانے لگے۔ اس سے دین کا پورا نظام اور اس کا مزاج لازماً متاثر ہو کر رہے گا۔

دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کے سلسلے میں بھی اصول و فروع کی رعایت نہایت ضروری ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ جو قدم پہلے اٹھنا چاہیے وہ بعد میں اٹھے اور جو قدم بعد میں اٹھنا چاہیے وہ پہلا قدم ہو جائے۔ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ ہماری ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ دین میں جس بات کو اصل اور اساس کی حیثیت حاصل ہے اس کو مضبوط کرنے سے پہلے فروعِ دین پر سارا زور صرف ہونے لگتا ہے اور ساری بحثیں ان ہی کے گرد گردش کرنے لگتی ہیں۔ یہ ایک غیر فطری طریقہ ہے۔ اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

یہاں قرآن مجید کی روشنی میں ترجیحات دین کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱- مکہ میں قرآن مجید کا تقریباً دو تہائی حصہ نازل ہوا۔ اس میں اصل زور اسلام کے عقائد پر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت، رسالت اور اس کی ضرورت،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخرت اوراس کی تفصیلات زیر بحث آئی ہیں۔ ان کے حق میں دلائل دیے گئے ہیں۔ ان پر جو اعتراضات ہورہے تھے، ان کی تردید کی گئی ہے اور جو شکوک وشبہات پھیلائے جارہے تھے انھیں رفع کیا گیا ہے۔ یہی عقائد اسلام کی اساس ہیں۔ جب یہ مستحکم ہوگئے تو شریعت کی تفصیلات فراہم کی گئیں جو دراصل ان ہی عقائد کے لازمی تقاضوں کے طور پر سامنے آرہی تھیں۔

۲-قرآن مجید نے بتایا کہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ اس پر اسی کا حکم چل رہا ہے۔ وہ ہر آن اس کی تسبیح وتحمید میں لگی ہوئی ہے اور اس کے احکام بجالارہی ہے۔ اس کے اقتدار میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی انسان کا خالق و مالک ہے۔ وہ اس کا بندہ اور مخلوق ہے۔ اس کے لیے زندگی کا صحیح ترین راستہ یہ ہے کہ وہ اللہِ واحد کی عبادت اختیار کرے اور اس کے احکام بجالائے۔ وہ اگر اس سے انکار کرتا ہے یا عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے تو انتہائی غلط راہ پر چلتا ہے اور تباہی کو دعوت دیتا ہے۔ اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:

يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ○ (الاعراف:۵۹)

اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے علاوہ تمھارا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ (اس سے انحراف کے نتیجے میں) کہیں تم بڑے دن کے عذاب میں نہ پکڑے جاؤ۔

یہی بات ہر پیغمبر نے کہی ہے۔

عبادت دراصل اس بات کا اظہار واعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان اپنا معبود برحق تسلیم کرتا ہے اور اس کے سامنے پوری طرح سرنگوں ہورہا ہے۔ اس کے ہر حکم کو تسلیم کرتا اور اس کی نافرمانی کو اپنے لیے جائز نہیں تصور کرتا ہے۔ یہ اللہ کے نازل کردہ پورے نظام شریعت کو قبول کرنے کا اعلان ہے۔ اگر صحیح معنیٰ میں جذبۂ عبادت پیدا ہوجائے تو احکام شریعت کی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی۔ اسلام نے دورِ اوّل میں جذبۂ عبادت کو اس قدر ابھارا اور مضبوط کیا کہ نظامِ شریعت پر عمل مشکل نہیں رہا۔ دل وجان سے اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پابندی ہوتی رہی۔

۳-قرآن مجید میں اللہ کے رسولوں کا اور ان کی دینی جد و جہد کا ذکر کہیں اختصار سے اور کہیں تفصیل سے ہوا ہے۔ اس سے وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنے زمانے میں ان ہی اساسات پر اصلاً زور دیا اور ان ہی کی روشنی میں فکری و عملی اصلاح کی کوشش کی۔ اللہ کے پیغمبر جن قوموں میں آئے ان میں بہت سی سماجی اور اخلاقی خرابیاں موجود تھیں۔ ظلم اور ناانصافی تھی، جان و مال محفوظ نہ تھے اور حقوق پامال ہو رہے تھے۔ اللہ کے پیغمبروں نے بتایا کہ یہ ساری خرابیاں اس لیے ہیں کہ ان فکری اساسات کو تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے جنھیں وہ پیش کر رہے ہیں۔ اگر فرد اور معاشرہ خدا کو اس طرح مانے جس طرح ماننا چاہیے، اس کی ہدایت کو قبول کرے اور آخرت کی باز پرس کا یقین ابھر آئے تو پوری زندگی کا رُخ صحیح ہو سکتا ہے اور انسان پر دنیا اور آخرت کی کامیابی کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ یہی طریقہ ہے جس سے کسی بھی فساد زدہ معاشرہ کی اصلاح کا امکان ہے۔ جب تک اسلام کی اساسات پر ایمان نہ ہو اور وہ دل و دماغ میں پیوست نہ ہو جائیں، سماج میں کسی صالح انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۴-قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کے ساتھ انسانوں کے حقوق کو خاص اہمیت دی ہے۔ ان میں سے بعض حقوق کو قانونی درجہ حاصل ہے۔ یہ حقوق اگر ادا نہ ہوں تو انسان کی گرفت ہوگی۔ لیکن بعض حقوق کی حیثیت اخلاقی ہے۔ ان سے ہم دردی اور محبت کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں۔ اس سے قطع نظر قرآن کے نزدیک خدا، رسول اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان دور و نزدیک کے حق داروں کے حقوق ادا کرے اور اس کے اندر نوعِ انسانی کی خدمت کا جذبہ پایا جائے۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کے کام آئے اور ان کی ہر ممکن مدد کرے۔ یہ بات ایمان کے منافی ہے کہ ایک شخص کو تمام حقوق حاصل ہوں، وہ عیش کی زندگی گزارے اور اس کے آس پاس کے لوگ اپنی بنیادی ضروریات تک پوری نہ کر پا رہے ہوں۔ وہ مدد کے محتاج ہوں اور ان کی مدد نہ کی جائے۔ جس انسان کے اندر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم دردی وغم خواری کے جذبات نہ ہوں اور جو ناداروں اور محتاجوں کے کام نہ آئے اور ان کے حقوق نہ پہچانے اسے خدا پرست مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کی مکی سورتوں میں ایک مختصر سورت 'البلد' ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی بعض نعمتوں کا ذکر ہے کہ اس نے انسان کو آنکھیں عطا کیں، زبان دی، ہونٹ دیے اور بھلائی اور برائی کے راستے بتا دیے۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَکُّ رَقَبَةٍ ○ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ○ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ○ ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ○ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ○ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ○ عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ○ (البلد:۱۱-۲۰)

پس وہ گھاٹی میں داخل نہیں ہوا۔ تمھیں کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ ہے گردن کو چھڑانا (غلام کو آزاد کرنا) یا بھوک کے دنوں میں کھانا کھلانا قرابت دار یتیم کو یا مسکین کو جو (فاقہ کی وجہ سے) خاکِ زمین پر پڑا ہوا ہے۔ پھر ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنھوں نے صبر کی اور رحم کی ایک دوسرے کو تاکید کی۔ یہی لوگ دائیں جانب والے ہیں (جن کے دائیں ہاتھ میں ان کا نامۂ اعمال ہوگا) اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ بائیں جانب والے ہیں (جن کا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں ہوگا) ان پر آگ ہر طرف سے ہوگی۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بہ کثرت موجود ہیں، جن سے انسانی حقوق کی اہمیت واضح ہوتی ہے[۱]

قرآن مجید نے حقوق العباد کو جو مقام دیا ہے، ہماری ترجیحات میں اسے وہ مقام حاصل ہونا چاہیے۔ ورنہ دین کا ناقص تصور ابھرے گا اور سماج کے لیے اس کی ضرورت اور اہمیت واضح نہ ہو سکے گی۔

۵- قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات میں اخلاق کی تعلیم بہت نمایاں ہے۔ اس نے آغاز ہی سے اعلیٰ اخلاق کی ترغیب دی۔ رذیل اخلاقیات کی شدید مذمت کی اور ان

۱؎ اس کی تفصیل راقم کی کتاب 'معروف ومنکر' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اجتناب کی تاکید کی ہے۔ اخلاق کا جذبہ اور پاکیزہ اخلاق کا رجحان انسان کی فطرت میں ہے، لیکن اس پر بعض اوقات پردے پڑ جاتے ہیں۔ جب تک یہ پردے نہ ہٹائے جائیں بے غرض اخلاق کا ظہور نہیں ہوتا۔ قرآن کے نزدیک خدا اور آخرت پر یقین ہی سے صداقت و راست بازی، دیانت و امانت، احترام آدمیت، عفت و عصمت، محبت و رافت، تواضع اور خاک ساری اور عفو و درگزر جیسی اعلیٰ اخلاقیات ابھرتی ہیں۔ اگر آدمی کو خدا کی ذات پر یقین نہ ہو، اس کی ہدایت سے وہ محروم ہو اور آخرت کی باز پرس کا اسے اندیشہ نہ ہو تو کسی نہ کسی رُخ سے اور کسی نہ کسی عنوان سے وہ اخلاقی پستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے اندر کچھ اخلاقی خوبیاں پائی بھی جائیں تو ان سے زیادہ اخلاقی خرابیاں اسے دامن گیر رہتی ہیں، جن سے وہ محفوظ نہیں رہتا۔ افسوس کہ اخلاق کی عظمت اور اہمیت امت کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کا کوئی اخلاقی امتیاز نہیں رہ گیا ہے، بلکہ دوسری قومیں اپنے اخلاق و کردار میں بعض پہلوؤں سے ممتاز ہیں۔ امت کو اخلاقی لحاظ سے اوپر اٹھانے کی سنجیدہ کوشش بھی نہیں ہو رہی ہے۔ اسلام فرد کی جس طرح تربیت کرتا اور جو پاکیزہ معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کی اساس میں اخلاق شامل ہے۔ اس کے بغیر اسلامی سیرت اور اسلامی معاشرہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق کو اسی حیثیت سے اختیار کرنے اور دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

٦- اللہ کے رسولوں کی اولین ذمے داری دعوت و تبلیغ اور اہل ایمان کی اصلاح و تربیت رہی ہے۔ دعوت کے ذریعے وہ دین کا ہمہ گیر اور انقلابی تصورِ حیات پیش کرتے ہیں اور جو لوگ اسے قبول کرتے ہیں ان کے فکر و عمل کی اس تصورِ حیات کے تحت تربیت کرتے ہیں۔

امت مسلمہ کو بھی یہ دونوں ہی کام انجام دینے ہیں۔ جہاں تک اہلِ ایمان یا امت مسلمہ کی اصلاح کا تعلق ہے اس کی طرف علماء، صلحاء اور مصلحینِ امت کی توجہ رہی ہے۔ انھوں نے تذکیر و تفہیم، وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کے ذریعے اسے بگاڑ سے بچانے اور راہ راست پر قائم رکھنے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدارس و مکاتب اور جامعات کے قیام کے ذریعے بھی یہ مقصد حاصل ہوتا رہا ہے۔اسی کے ساتھ امت کی علمی، معاشی اور سیاسی فلاح کے لیے بھی مسلسل کوششیں ہوتی رہی ہیں۔اس سلسلے کے بعض اقدامات سے اختلافات کیا جاسکتا ہے،لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کوششیں بہ ہر حال امت کی مادی اور دنیوی ترقی ہی کے لیے رہی ہیں۔

دعوت و تبلیغ کا میدان بھی بالکل خالی نہیں رہا۔اس میں کوششیں ہوتی رہی ہیں اور بعض بہت قابلِ قدر بھی ہیں،لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کارِ دعوت ہماری ترجیحات میں شامل نہیں رہا ہے۔اس کے بعض پہلوؤں کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔اس سے اس کی اہمیت اور نزاکت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔قرآن مجید نے اُمت کے مقصدِ وجود کو ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ

تم خیر اُمت ہو جسے لوگوں کی ہدایت و رہ نمائی کے لیے نکالا گیا ہے۔تم معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (آل عمران:۱۱۰)

آیت میں 'اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔'اَلنَّاس' کے اندر ہر دور اور ہر خطہ ارض کے تمام انسان آتے ہیں۔اس پر 'لِ' حرف جار آیا ہے۔اس میں، جیسا کہ اہل علم نے بیان کیا ہے، نفع پہنچانے کا تصور ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کا وجود اس لیے ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔اس فائدہ کی شکل بھی آیت میں بتا دی گئی ہے کہ وہ تمام عالم میں 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا فرض انجام دے۔معروف و منکر کے الفاظ وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔علماء نے لکھا ہے کہ سب سے بڑا معروف توحید اور سب سے بڑا منکر شرک ہے۔اسلام نے جن نیکیوں کی تعلیم دی ہے وہ سب معروفات ہیں اور جن برائیوں سے منع کیا ہے وہ سب منکرات میں آتے ہیں۔اس طرح دین کے پورے نظامِ فکر و عمل کی دعوت دینا امر بالمعروف ہے اور مخالفِ دین افکار و نظریات اور ان پر مبنی طرز ہائے حیات کی کم زوریاں اور خامیاں واضح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا اوران سے بچانے کی کوشش کرنا نہی عن المنکر ہے۔[۱]

قرآن مجید میں اس امت کو 'اُمت وسط' بھی کہا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط	اسی طرح ہم نے تم کو 'امت وسط' بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو، اور رسول تم پر گواہ ہو۔

(البقرۃ:۱۴۳)

'امت وسط' کے معنیٰ ہیں اعلیٰ وارفع امت یا وہ امت جو راہِ اعتدال پر قائم ہے۔ اس کی ذمے داری یہ بتائی گئی ہے کہ وہ 'شہادت علی الناس' کا فرض انجام دے۔ یعنی انسانوں کے سامنے اسلام کے دین حق ہونے کی شہادت دے اور دلائل سے ثابت کرے کہ دنیا و آخرت میں نجات و فلاح کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ یہ فرض اللہ کے پیغمبر ہر دور میں کما حقّہ ادا کرتے رہے ہیں۔ آخری رسول حضرت محمد ﷺ نے بھی اس فرض کو بدرجۂ کمال ادا فرمایا، جس کے نتیجے میں یہ امت وسط وجود میں آئی۔ اب یہی فرض اس امت وسط کو تا قیامت انجام دیتے رہنا ہے۔

قرآن مجید کا حکم ہے کہ جو لوگ اللہ سے اور اس کے دین سے غافل ہیں انھیں جگایا جائے اور ان تک اللہ کا دین پہنچایا جائے۔ اسی لیے اس کا نزول ہوا ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ○ (یٰسٓ:٦)	تا کہ تم اس قوم کو (انجام بد سے) ڈراؤ جس کے باپ دادا کو ڈرایا نہیں گیا اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس آیت میں خطاب رسولِ اکرم ﷺ سے ہے اور اہل عرب کے درمیان 'انذار' کا حکم ہے، جو زندگی کی غلط راہ پر دوڑے چلے جا رہے تھے اور جس کے بھیانک نتائج سے باخبر کرنے کے لیے کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا۔ یہ صورتِ حال آج بہت سی قوموں کی ہے، جن کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ صدیوں سے ان تک اللہ کا دین نہیں پہنچا

---

[۱] اس کی کسی قدر تفصیل راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور ان کے درمیان انذار کا فرض نہیں انجام پایا ہے۔ اب جب کہ سلسلۂ رسالت منقطع ہو چکا ہے اس امت ہی کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ دنیا کو اس کی غلط روی کے انجام سے آگاہ کرے اور بتائے کہ اللہ کی کتاب اسی مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا وَّ لٰـکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○ (سبا:۲۸)	ہم نے تو آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

رسول اللہ ﷺ بشیر اس معنی میں ہیں کہ اللہ کے نازل کردہ دین کو قبول کرنے پر آپ نے دنیا میں بہتر زندگی اور آخرت میں فلاح و کامرانی کی خوش خبری دی۔ آپ کو نذیر اس پہلو سے کہا گیا ہے کہ غلط فکر و عمل اختیار کرنے اور اللہ کے دین کو رد کرنے پر دونوں جہاں کے خسارے سے آپ نے آگاہ کیا اور اس کے بھیانک انجام سے ڈرایا۔

اسی طرح آپؐ کو ساری دنیا کے لیے رحمت قرار دیا گیا ہے:

وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ○ (الانبیاء:۱۰۷)	ہم نے تو آپ کو سارے جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا وجود، آپ کی رسالت، آپ کا تصورِ حیات، آپ کا نظامِ فکر و عمل اور آپ کی سعی و جہد دنیا کے لیے سراسر رحمت ہے۔ اسے رد کرنا اللہ کی رحمت سے خود کو محروم کرنا ہے۔ آج دنیا اس سے ناواقف ہے کہ آپ ساری دنیا کے لیے بشیر و نذیر اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ اسے دلائل سے ثابت کرنا امت کے فرائض میں ہے۔ اس سے غفلت پر اس سے باز پرس ہوگی۔

موجودہ دور میں تبلیغِ دین کا فرض مطلوبہ معیار سے انجام دینے کے لیے اس کے ذہنی و فکری رجحان کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اس وقت پوری دنیا پر ایک طویل عرصہ سے الحاد اور دہریت کی حکومت ہے۔ مغربی قوموں نے، جن کے ہاتھوں میں دنیا کی قیادت ہے، الحاد اور دہریت کو ایک فلسفۂ حیات کے طور پر اس طرح پیش کیا ہے کہ دین اور اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اساسی تعلیمات بے معنٰی ہوکر رہ گئی ہیں۔ انسان کو زندگی کے کسی بھی مرحلے میں، کسی بھی میدان میں اور کسی بھی قدم پر ان کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ نرسری میں جو بچہ داخلہ لیتا ہے، وہ بڑا ہوکر گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن تک تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اس سے آگے ریسرچ اور تحقیق کے مرحلہ میں بھی پہنچ جاتا ہے، لیکن اس کے سامنے کبھی وحی و رسالت یا آسمانی ہدایت کا سوال نہیں ابھرتا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک پاکستانی نوجوان سے، جو ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا پر ریسرچ کر رہا تھا، انھوں نے سوال کیا کہ ڈاروِن کی اس تھیوری کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا فی الواقع بندر نے ترقی کر کے انسان کی موجودہ ہیئت اختیار کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے، میں اسے نہیں مان سکتا۔ انھوں نے پوچھا: تمھارا مطالعہ اور تحقیق کیا کہتی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ موجودہ تحقیق تو ڈاروِن ہی کے حق میں جاتی ہے۔ یہی حال تمام علوم وفنون کا ہے۔ آج تعلیم، تہذیب، تمدن، معیشت، قانون اور سیاست ہر شعبۂ حیات کا رُخ الحاد نے متعین کیا ہے، جس میں خدا، وحی و رسالت اور آخرت جیسے مابعد الطبیعیاتی نظریات کہیں زیر بحث نہیں آتے اور کسی مسئلہ کے حل کے لیے ان کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ جب تک اس کی ضرورت ثابت نہ کی جائے موجودہ دور کا رُخ نہیں بدل سکتا۔

دورِ جدید میں مذہب ایک انفرادی معاملہ ہوکر رہ گیا ہے۔ اجتماعی امور و معاملات سے اسے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ اسلام کو اگر کوئی شخص اپنے عقیدے کے طور پر اختیار کرے اور اپنی نجی زندگی میں اس پر عمل کرے تو شاید کسی کو اعتراض نہ ہو۔ لیکن اس کی اجازت کسی کو نہیں ہے کہ اجتماعی امور میں اسلام کی تعلیمات کو اپنائے اور ان کے مطابق اپنے معاملات طے کرے۔ اب یہ ثابت کرنا امت کی ذمے داری ہے کہ اسلام صحیح عقیدہ ہی فراہم نہیں کرتا، بلکہ اس کی بنیاد پر ہر شعبۂ حیات کے لیے نہایت فطری اور معقول ہدایات بھی پیش کرتا ہے۔ اس سے زندگی اس بے روی اور بے اعتدالی سے محفوظ رہ سکتی ہے جس میں وہ آج گرفتار ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی سبیل اسے نہیں نظر آرہی ہے۔ یہ ایک طویل اور ہمہ جہت عمل ہے۔ اسلام کی سربلندی کے لیے بہر حال اسے انجام دینا ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام پر اعتراضات کی ایک طویل تاریخ ہے۔ آج تک بعض قدیم اعتراضات دہرائے جاتے ہیں۔ ان میں نئے اعتراضات کا اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ان میں بالعموم جارحیت اور اسلام دشمنی صاف نمایاں ہوتی ہے۔ کبھی غیر جانب داری کے انداز میں کہا جاتا ہے کہ اسلام نے اپنے وقت میں مفید خدمات ضرور انجام دی ہیں، لیکن اس کی بہت سی باتیں اصلاح طلب ہیں۔ وہ آج قابلِ قبول نہیں ہیں۔ اس نے مساوات کی بات تو کی ہے، لیکن بعض انسانوں کو جو حقوق دیے ہیں ان سے بعض دوسرے انسانوں کو محروم رکھا ہے۔ کسی وقت کہا جاتا تھا کہ اسلام اپنی فطری خوبیوں کی وجہ سے نہیں پھیلا، بلکہ تلوار کے زور سے اس کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔ اب اسلام کے ساتھ تشدد اور تخریب کو بھی جوڑ دیا گیا ہے کہ اسلام غارت گرِ امن و امان ہے۔ وہ اپنی صداقت دلائل سے نہیں ثابت کرتا، بلکہ طاقت کے ذریعے اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس طرح کے اور بھی اعتراضات ہیں، جن کے ذریعے اسلام کی تصویر مسخ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، تاکہ دنیا کی اس طرف توجہ ہی نہ ہو، لیکن اس میں خیر کا پہلو یہ ہے کہ اس نے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ جو اعتراضات کیے جارہے ہیں ان کا جواب دیا جائے اور جن پہلوؤں سے اسلام سے بدظن کرنے کی کوشش ہورہی ہے ان پہلوؤں سے مطمئن کیا جائے اور اسلام کی حقانیت ثابت کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اہل علم اس طرف متوجہ ہیں اور مفید خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن کام اتنا بڑا ہے کہ اس کا حق صحیح معنیٰ میں اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ اس کے لیے پوری ایک جماعت کھڑی ہو جس میں مختلف صلاحیت کے افراد ہوں، جو منصوبہ بند اور منظّم طریقہ سے اسلام کا دفاع ہی نہ کرے، بلکہ دنیا کے تمام نظریات کے مقابلہ میں اس کی برتری ثابت کرے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ترجیحاتِ دین کو سمجھنے اور اس کے مطابق راہِ عمل اختیار کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

☆

© rasailojaraid.com